Fikr-o-Nasar (Islamabad) 6:3 (1968)

پاکستان میں اسلامی قانون کا مستقبل

ملک محمد جعفر ایڈووکیٹ

گو حال میں بعض حلقوں کی طرف سے اس بارے میں کچھ نزاعی بحث کی صورت پیدا کی گئی ہے ، تاہم یہ بات ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ پاکستان من حیث القوم اس پالیسی کا پابند ہے کہ تمام موجودہ قوانین میں ایسی تبدیلیاں عمل میں لائی جائیں کہ ان میں اسلامی تعلیمات کے ساتھ مطابقت پیدا ہو۔ اور جدید قانون سازی کا عمل قرآن اور سنّت کے شرعی احکام کے تابع رکھا جائے۔

تحریکِ پاکستان کے عوامل کی خواہ کوئی توجیہہ ہی کی جائے ، یہ امر ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ اس تحریک میں ایک مقصد جو اس برّصغیر کے مسلمانوں کے پیشِ نظر تھا ، وہ ایک اسلامی ریاست کا تصور تھا ، جو اُس خطۂ زمین میں قائم ہونی تھی جس کے حصول کے لئے قوم کوشاں تھی۔ یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ اس سے مراد تحریک کے دوسرے مقاصد اور موجبات کی نفی نہیں ہے۔ اور نہ یہ کہ خود اسلامی ریاست کے تفصیلی ڈھانچے کے متعلق تمام لوگ متحد الخیال تھے۔

جہاں تک اصل مقصد کا تعلق ہے، یہ معاملہ اب نظری بحث سے آگے جا چکا ہے۔ اور آئینِ پاکستان کا حصہ ہے۔ اسلامی مملکتِ پاکستان کے آئین کی تمہید اس اعلان سے کی گئی ہے کہ "تمام کائنات کی حاکمیتِ اعلیٰ کی حامل بلا شرکتِ غیرے اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اور یہ کہ انسان کے لئے خدا تعالیٰ کی مقررہ کردہ حدود کے اندر اختیارات کا استعمال ایک مقدس امانت کی حیثیت رکھتا ہے۔"

یہ اعلان اور بالخصوص اس کے الفاظ "خدا کی مقرر کردہ حدود" کسی قدر تفصیلی جائزہ کے مستحق ہیں۔ ظاہر ہے کہ حاکمیتِ اعلیٰ جو اس اعلان میں مذکور ہے، اس سے مراد کائناتی قوانینِ فطرت نہیں ہو سکتے۔ ان قواعد کے متعلق خدا تعالیٰ کے کلّی اختیارات اور قدرتِ کاملہ ایسے مسلّمات ہیں کہ آئین جیسی دستاویز میں اُن کا اعلان نہ صرف غیر ضروری ہے بلکہ ایک طرح کی نامناسب جسارت تصور ہو گا۔ اسی طرح "خدا کی مقرر کردہ

حدود" سے مراد وہ حدود نہیں ہیں، جو اٹل فطری قوانین کے عمل سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور جن سے باہر جانا انسان کے اختیار میں ہی نہیں۔

حقیقت میں اس اعلان کا مفہوم متذکرہ بالا اُمور سے جدا ہے۔ دراصل اس اعلان کے ذریعہ ہم نے پورے صمیم قلب کے ساتھ ایک ایسے اصول کی توثیق کی ہے جو مسلمانوں کے لئے جزو ایمان کا درجہ رکھتا ہے۔ یعنی یہ کہ انسانی عمل کے تمام شعبوں میں کسی فعل کو جائز یا ناجائز قرار دینے کا آخری اختیار اللہ تعالیٰ کی ذات کو حاصل ہے اور مسلمان چونکہ خدا کی اس حاکمیتِ اعلیٰ پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس لئے وہ اپنے انفرادی یا اجتماعی اعمال کے متعلق غیر محدود آزادی کے ساتھ فیصلہ کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔ بلکہ وہ ان تمام امور میں اپنے ربّ کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہنے کے پابند ہیں۔

آئین پاکستان کا یہ پہلو ایک منفرد تجربہ ہے۔ اور عصر حاضر کی تاریخِ آئین سازی میں اس کی مثال موجود نہیں ہے۔

یہاں یہ ذکر کر دینا مناسب ہوگا کہ پاکستان میں یہ اصولی اعلان موجودہ آئین کے ذریعہ پہلی بار نہیں کیا گیا۔ ۱۹۵۶ء کے منسوخ شدہ آئین کی تمہید کے پہلے پیراگراف کے الفاظ بالکل وہی ہیں جو موجودہ آئین کے متعلقہ حصہ سے اوپر نقل کئے گئے ہیں۔ اس بارے میں ان دو آئینی دستاویزات میں صرف یہ فرق تھا کہ موجودہ آئین کی تمہید میں اُس کے نفاذ کے وقت یعنی ۱۹۶۲ء میں "اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود" کے الفاظ موجود نہ تھے۔ گو مقصد کے لحاظ سے اس سے چنداں فرق نہ پڑتا تھا تاہم مزید وضاحت کے لئے آئین کے پہلے ترمیمی ایکٹ مجریہ سال ۱۹۶۳ء کی رو سے تمہید میں ان الفاظ کے اضافے سے اس ضمن میں موجودہ آئین کو مکمل طور پر سابق آئین کے مطابق بنا دیا گیا ہے۔

غرض ماحصل یہ ہے کہ آئین کے دوسرے پہلوؤں کے بارے میں ملک کے سیاسی مکاتبِ فکر میں اختلاف کے باوصف اسلامی قانون کے متعلق آئین کا یہ بنیادی مقصد پاکستانی قوم کے ایک متفق علیہ اور مصمم ارادے کا مظہر ہے اور اس میں اختلاف کی گنجائش نہیں۔

اس اعلان کے آخری الفاظ کی اہمیت بھی غور طلب ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود کے اندر انسان کی طرف سے تمام اختیارات کے استعمال کو ایک مقدس امانت قرار دیا گیا ہے۔ اس طرح آئین کی رُو سے تمام قانون سازی کا عمل ایک اعلیٰ اخلاقی قدر کے تابع رکھا گیا ہے۔

ان دونوں تصورات کی بنیاد خود قرآن پر ہے۔ جس میں خلافتِ آدم کو ایک ایسی امانت قرار دیا گیا ہے جو خدا نے انسان کو سونپی ہے اور جس کو انسان نے اُس کی تمام ذمہ داریوں کے ساتھ بخوشی قبول کیا ہے۔ اور اس ذمہ داری میں انسان کی طرف سے یہ اقرار شامل ہے کہ اپنے معاملات میں حدود اللہ سے تجاوز نہ کرے گا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ ہمارے قانون سازی کے دائرے کے متعلق خدا تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود کیا ہیں اور حدود کے مقرر کئے جانے سے کیا مراد ہے؟

ان سوالات کا تفصیلی جائزہ لینے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس مرحلہ پر آئین کی چند دیگر شقوں کا ذکر کر دیا جائے جو موجودہ بحث سے تعلق رکھتی ہیں۔

آئین کا حصہ دوئم بنیادی حقوق اور اصولی مقاصد کے بیان پر مشتمل ہے۔ اس حصے کے دوسرے باب میں سب سے پہلا اصول ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے :-

"پاکستان میں کوئی ایسا قانون وضع نہیں کیا جائے گا جو اُن اسلامی
تعلیمات اور احکام کے خلاف ہو جو قرآنِ کریم اور سنّت میں مذکور ہیں۔
اور تمام موجودہ قوانین کو قرآن اور سنّت کے مطابق بنایا جائے گا۔"

اس اصول کی تشریح کے طور پر یہ صراحت کر دی گئی ہے کہ اس اصول کے تحت کسی اسلامی فرقے کے شخصی قانون کے نفاذ کے بارے میں "قرآن اور سنّت" سے مراد قرآن اور سنّت کی صرف وہ تعبیر ہے جو اُس فرقے کے نزدیک مسلّم ہے۔

یہ تشریح بڑے دُور رس نتائج کی حامل ہے، جن پر بعد میں کچھ تنقید کی جائے گی۔ لیکن اس سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آئین میں بیان کردہ "اصولی مقاصد" کے قانونی مقام کے متعلق ایک بنیادی امر کی وضاحت کر دی جائے ——— گو بنیادی حقوق اور اصولی مقاصد ایک ہی موضوع سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور دونوں میں وہ قومی نظریات بیان کئے گئے ہیں جن کی حیثیت مستقل اور غیر مبدل ہے۔ لیکن عملاً اس بات میں ایک اہم فرق ہے کہ آیا کوئی معاملہ آئین کے بنیادی حقوق میں شامل کیا گیا ہے یا اس کو صرف اصولی مقاصد کے زمرہ میں جگہ دی گئی ہے۔ اوّل الذکر صورت میں متعلقہ حق عدلیہ کے ذریعہ قابلِ نفاذ حیثیت حاصل کر لیتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شہری اپنے اس حق کے تحفظ اور اجراء کے لئے عدالت سے چارہ جوئی کر سکتا ہے۔ مزید برآں آئین کی رُو سے تمام قوانین کے جواز کے لئے ایک عمومی شرط یہ رکھی گئی ہے کہ یہ قوانین، خواہ اس وقت نافذ العمل

ہوں یا آئندہ وضع کئے جائیں، بنیادی حقوق کے خلاف نہ ہونے چاہئیں۔

بنیادی حقوق کے باب کے آرٹیکل نمبر ۸ کی رو سے جو قانون یا رواج کسی بنیادی حق سے متصادم ہو وہ اُس اختلاف کی حد تک کالعدم تصور ہوگا اور مملکت کے کسی ادارے کو یہ اختیار نہ ہوگا کہ کوئی ایسا قانون نافذ کرے جو آئین میں مذکور کسی بنیادی حق کو زائل کرتا ہو یا جس سے ایسے کسی حق میں تخفیف واقع ہوتی ہو۔ موجودہ قوانین اور رواج کی طرح آئندہ کے وہ قوانین بھی باطل تصور ہوں گے جن سے بنیادی حقوق کی خلاف ورزی ہوتی ہو۔ اس ضمن میں اس امر سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ متعلقہ قانون ایک ایسی مقننہ نے پاس کیا ہے جسے اُس شعبے میں قانون سازی کے مکمل اختیارات حاصل تھے۔ کیونکہ اس امر کا فیصلہ کرنے کا آخری اختیار عدالت کو حاصل ہے کہ آیا کسی قانون سے بنیادی حقوق کی نفی واقع ہوتی ہے یا نہیں۔

لیکن اصولی مقاصد (PRINCIPLES OF POLICY) کو یہ حیثیت حاصل نہیں ہے۔ گو یہ درست ہے کہ آئین کی رو سے مملکت کے ہر با اختیار ادارے اور رکن کا یہ فرض قرار دیا گیا ہے کہ اپنی پالیسی کو اصولی مقاصد کے ساتھ ہم آہنگ بنائے لیکن ساتھ ہی خود آئین میں یہ صراحت کر دی گئی ہے کہ اس امر کا فیصلہ کرنے کا اختیار کہ آیا کسی ادارے کا کوئی خاص عمل اصولی مقاصد کے مطابق ہے یا نہیں، صرف اُس متعلقہ ادارے کو ہی حاصل ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ گو دیگر اداروں کی طرح ہماری مجالسِ قانون ساز بھی شریعتِ اسلامیہ کی پیروی کرنے کی پابند ہیں۔ تاہم قانون سازی کے شعبے میں قومی اور صوبائی اسمبلیاں اپنے اپنے دائرۂ اختیار میں اس سوال کا فیصلہ کرنے میں مکمل طور پر خود مختار ہیں کہ آیا کوئی زیرِ تجویز قانون اسلامی تعلیمات اور احکام کے مطابق ہے یا نہیں۔ اس معاملہ میں کوئی شک و شبہ نہیں چھوڑا گیا۔ کیونکہ آئین کی ایک دوسری شق میں بالصراحت یہ بیان کر دیا گیا ہے کہ کسی قانون یا دیگر کارروائی کے جواز کو اس بنا پر چیلنج نہیں کیا جائے گا کہ یہ آئین میں مذکور اصولی مقاصد کے منافی ہے۔ اور نہ اس بنا پر حکومت، اُس کے کسی رکن یا ادارے یا دیگر کسی فرد کے خلاف کوئی قانونی چارہ جوئی کی جا سکے گی۔

اس سے ظاہر ہوگا کہ جہاں تک عدالتی نفاذ کا تعلق ہے، آئین نے اُصولی مقاصد کو بمقابلہ بنیادی حقوق کے کم تر درجہ پر رکھا ہے۔ لیکن اس سے یہ قیاس کرنا غلط ہوگا کہ دونوں کی اہمیت میں کوئی فرق ہے۔

ہم نے بطور ایک آزاد اور خود مختار قوم کے ایک طویل عرصہ کے غور و خوض کے بعد پوری متانت اور دیانت داری کے ساتھ اس امر کا فیصلہ کیا ہے کہ ہم اپنے تمام موجودہ قوانین کو اسلام کے مطابق بنائیں گے اور جدید قانون سازی میں اسلامی احکام کو ملحوظ رکھیں گے۔ اب اس ارادے سے انحراف یا اس مقصد کے حصول میں کوتاہی کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم اپنے آپ سے دیانت نہیں برت رہے ہیں۔

اصولی مقاصد کے متعلق قانونی قوتِ نافذہ کی گرفت اگر نہ بھی ہو تو بھی ایک بات میں تو کوئی شک نہیں ہے۔ قانون ساز اداروں سے متعلق تمام افراد جن میں قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے اراکین کے علاوہ صدرِ مملکت اور صوبوں کے گورنر بھی شامل ہیں اپنے عہدوں کے حلف کی رو سے اس امر کے پابند ہیں کہ اپنے فرائضِ منصبی پوری دیانت داری اور قابلیت کے ساتھ انجام دیں گے اور اس بارے میں آئین کی پیروی کریں گے اور جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے اصولی مقاصد آئین کا ایک اہم حصہ ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ آئین کے تحت بنیادی حقوق اور اسلامی تعلیمات میں جو امتیاز روا رکھا گیا ہے وہ ان دونوں شعبوں کی باہمی اہمیت کے کسی اختلاف کی بنا پر نہیں ہے۔ بلکہ اس کی وجہ یہ عملی دِقّت ہے کہ ملک میں موجودہ نافذ العمل ضخیم اور وسیع قوانین کو جو زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہیں فوری طور پر قرآن اور سنّت کے احکام کے مطابق بنانا ممکن نہیں ہے۔ یہ کام اپنی نوعیت اور ضخامت دونوں کے لحاظ سے ایک انقلابی اقدام ہے۔ اور اس کے حصول کے لئے ایک لمبی جدوجہد ضروری ہوگی اور کئی رکاوٹوں کو دُور کرنا ہوگا۔

موجودہ مضمون کا مقصد یہ ہے کہ ان دِقّتوں کا جائزہ لیا جائے اور اُن ذرائع پر غور کیا جائے جن کی مدد سے ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

مقصد تو واضح ہے۔ ہمیں موجودہ قوانین کو اسلامی تعلیمات کے مطابق بنانا ہے۔ اور آئندہ کے لئے ایسے ذرائع اختیار کرنے ہیں جو اِس امر کی مؤثر ضمانت ثابت ہوں کہ کوئی ایسا جدید قانون وضع نہ ہونے پائے جو قرآن اور سنّت کے شرعی احکام کے منافی ہو۔ سوال صرف یہ ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لئے کون کون سے طریقِ کار موزوں اور قابلِ عمل ہیں۔

ایک سادہ طریق جو فوری طور پر ذہن میں آتا ہے، یہ ہے کہ آئین میں اسلامی تعلیمات کی پابندی کی شق کو جو اس وقت اصولی مقاصد میں شامل ہے ایک بنیادی حق قرار دے دیا جائے۔ اس کا اثر

یہ ہو گا کہ بغیر کسی مزید کارروائی کے قرآن اور سنّت کے قانونی احکام اُن حقوق کی فہرست میں آجائیں گے جو عدالتی کارروائی کے ذریعہ محفوظ رکھے اور نافذ کئے جا سکتے ہیں۔ جس طرح کہ مثلاً قانونی مساوات کا حق ہے۔ اس تبدیلی کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اس بات کا فیصلہ کرنا عدالتوں کے اختیار میں آجائے گا کہ آیا کوئی قانون اسلامی تعلیمات اور احکام سے منافی ہونے کی بنا پر ناجائز اور کالعدم ہے۔

لیکن ہمارے حالات میں بظاہر یہ سادہ حل نہ مستحسن ہے اور نہ قابلِ عمل۔

سب سے پہلی دِقت تو یہ ہے کہ ہماری عدالتوں کے حاکم فی الحال عام طور پر اسلامی قانون میں وہ علمی مہارت نہیں رکھتے جو اس کام کے لئے لازم ہے۔ بالخصوص اگر عدالتوں کی ذمہ داری میں اسلامی فقہ کے اُن شعبوں کو بھی شامل کیا جائے جو برّصغیر ہند و پاکستان میں اس وقت ایک صدی سے زائد عرصہ تک بطور ملکی قانون نافذ نہیں کئے گئے۔ اور عملاً متروک رہ چکے ہیں۔

ثانیاً اگر عدلیہ کو اس بارے میں نہایت وسیع اختیارات بھی دے دیئے جائیں، تو بھی عدالتیں صرف یہ کر سکیں گی کہ کسی متنازعہ قانون کے جائز یا ناجائز ہونے کا فتویٰ دے سکیں۔ بالفرض اگر عدالت کی رائے میں کوئی قانون شریعت کے منافی پایا جائے تو وہ اس بنا پر ایسے قانون کے کالعدم یا ناجائز ہونے کا فیصلہ صادر کر سکتی ہے۔ لیکن عدالت کے اختیار اس سے آگے نہیں جا سکیں گے اور وُہ یہ نہ کر سکے گی کہ ناجائز ایکٹ کی بجائے اپنی طرف سے وضع کردہ کوئی ایسا قانون نافذ کرے جو عدالت کے نزدیک قرآن اور سنّت کے احکام کے مطابق ہو۔ کیونکہ یہ قانون سازی کا معاملہ ہے جو عدالت کے فرائض اور اختیارات سے خارج ہے۔

چونکہ موجودہ قوانین کے بیشتر حصے کی اساس سیکولر ہے۔ اور اُن کے وضع کرنے میں اسلامی احکام کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ اس لئے عدلیہ کی جانب سے اس طرح کے غیر محدود اختیارات کے استعمال کا اغلب نتیجہ یہ ہو گا کہ متنازعات کے کئی شعبوں میں ایک خلاء کی صورت واقع ہو جائے گی۔ جہاں کہ سرے سے کوئی قاعدہ ہی موجود نہیں ہو گا جس کے مطابق مقدمے کا فیصلہ کیا جا سکے۔

اس بارے میں آزادی سے قبل اس برّصغیر میں اسلامی قانون کے نفاذ اور عمل کا جائزہ ایک مفید مطالعہ ہو گا۔

ملک میں انگریزوں کی حکمرانی کے قیام کے ساتھ اسلامی قانون کا نفاذ بطور ایک عام ملکی قانون کے ختم ہو گیا۔ تاہم غیر ملکی حکمرانوں نے فیصلہ کیا کہ ہندوستانی رعایا کے ساتھ ایک رعایت کے طور پر چند

مخصوص اور معین معاملات میں اہلِ تنازعہ کا ذاتی قانون (پرسنل لاء) جاری رہے گا یعنی ان معاملات میں فریقینِ مقدمہ کے مسلمان ہونے کی صورت میں اسلامی قانون کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا اور اگر فریقین ہندو ہوں تو اُن کے اپنے مذہبی قانون پر انحصار کیا جائے گا۔

ان مخصوص معاملات کا دائرہ نہایت محدود تھا۔ نیز ہر علاقے میں اس کی صورت مختلف تھی مثلاً پریزیڈنسی کے قصبات اور وسطی ہند میں شخصی قانون کی حدود نسبتاً وسیع تھیں۔ یہاں علاوہ خاندانی اور ازدواجی تعلقات از قسم نکاح، طلاق، تولیت وغیرہ کے، وراثت کے معاملات میں بھی اسلامی قانون نافذ العمل رہا۔ اس کے مقابلہ میں شمالی ہندوستان اور بالخصوص پنجاب میں شخصی قانون کے نفاذ کا حلقہ زیادہ محدود تھا۔ ان علاقوں میں صورتِ حال زیادہ تر اختیاری نوعیت کی تھی۔ ایک قانون موسومہ پنجاب لاز ایکٹ مجریہ ۱۸۷۲ء کی رو سے قرار دیا گیا کہ:۔

> "وراثت، عورتوں کی خاص جائداد، منگنی، نکاح، طلاق، حق مہر، تبنیت، تولیت، نابالغی، خاندانی تعلقات، وصیت، ہبہ، تقسیم اور تمام مذہبی رسوم سے متعلق معاملات کا تصفیہ اوّلاً اُس رواج کے مطابق ہوگا جس کے فریقین پابند پائے جائیں بشرطیکہ یہ رواج انصاف، استحسان اور انسانی ضمیر کے تقاضوں کے منافی نہ ہو۔ اور نہ موجودہ یا کسی دیگر نافذ العمل قانون کی رُو سے باطل قرار دیا جا چکا ہو۔ اور بصورتِ دیگر ایسے اُمور کے فیصلہ کے لئے شخصی قانون پر انحصار کیا جائے گا یعنی مسلمانوں کے لئے اسلامی قانون پر اور ہندوؤں کی صورت میں ہندو لاء پر، سوائے اس کے کہ یہ قوانین مقننہ کے پاس کردہ کسی ایکٹ کے ذریعہ ترمیم یا منسوخ کر دیئے گئے ہوں یا مذکورہ بالا رواج کے ذریعہ تبدیل کر دیئے گئے ہوں۔"

اِس سے واضح ہوگا کہ اُس وقت اسلامی قانون کے نفاذ کا دائرہ کتنا محدود تھا۔ اوّل تو اس کا اطلاق صرف اُن مخصوص معاملات میں ہوتا تھا، جو محولہ بالا ایکٹ میں مذکور ہیں۔ اور ان معاملات میں بھی اسلامی قانون دو شرائط کے تابع تھا۔ اوّل یہ کہ متعلقہ امرِ تنازعہ کے بارے میں کسی مجاز مجلسِ قانون ساز کا وضع کردہ کوئی ایکٹ موجود نہ ہو۔ اگر کوئی ایسا ایکٹ نافذ ہو تو اُس کے مقرر کردہ قواعد نافذ ہوں گے۔ خواہ وہ اسلامی

قانون کے خلاف ہی ہوں۔ دوسرے یہ کہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ کوئی خاص قوم یا گروہ اس بارے میں کسی رواج کا پابند ہے تو اُن کے تنازعات بجائے شریعت کے، رواج کے مطابق تصفیہ پائیں گے۔

پنجاب میں یہ دوسری شرط خاص طور پر زیادہ اہم ثابت ہوئی۔ کیونکہ تحقیقات سے ظاہر ہوا کہ اس علاقہ کے بیشتر دیہاتی باشندے اپنے مذہبی قانون کے مقابلہ میں رواج کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس لئے ان علاقوں میں زرعی جائداد کی وراثت اور انتقالات کی نسبت بطور عام قاعدہ کے، وہ ضابطۂ قانون نافذ کیا جانے لگا جس کو عدالتی اصطلاح میں رواج زمیندارہ کہا جاتا ہے۔ جیساکہ معلوم ہے اس رواج کا ایک اہم تر حصہ وراثت کے قواعد ہیں جن کی رو سے عام طور پر عورتیں جائداد میں اپنے شرعی حق سے محروم رکھی جاتی تھیں۔

مختصراً اس صورت حال میں اسلامی قانون کے دائرۂ عمل کی حدود انتہائی محدود ہو کر رہ گئی تھیں۔

اس دَوران چند بار مسلمان وکلاء اور دیگر قانون دان حلقوں کی جانب سے اسلامی قانون کی حدودِ نفاذ کو وسعت دینے کی کوشش کی گئی۔ اس کے لئے طریق یہ اختیار کیا گیا کہ متعلقہ قوانین میں مندرجہ شخصی قانون کے معاملات کی وسیع تر تعبیر کی جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ امور اُن تنازعات کی فہرست میں شامل ہو جائیں جن کے تصفیہ کے لئے انگریزی قانون نے شریعتِ اسلامیہ سے رجوع کرنے کی اجازت دی تھی۔ لیکن بظاہر ان میں سے کوئی کوشش بھی کامیاب نہ ہو سکی۔

اس ضمن میں دو مثالیں پیش کرنا مناسب ہو گا۔

جیساکہ پہلے بیان ہو چکا ہے، وسطی ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے وراثت کے بارے میں اسلامی قانون نافذ تھا۔ ۱۸۸۴ء کے ایک مقدمہ (انڈین لاء رپورٹ ۷ الہ آباد صفحہ ۲۹۷) میں فیصلہ طلب امر یہ تھا کہ ایک مفقود الخبر مسلمان مالکِ جائداد کی موت کا قیاس کتنی مدت گزرنے کے بعد ہونا چاہیئے۔ ایک فریق کا مؤقف یہ تھا کہ چوں کہ معاملہ بنیادی طور پر وراثت کا ہے اس لئے اس کا فیصلہ شریعتِ اسلامیہ کے مطابق ہونا چاہیئے۔ اس مقدمہ میں جس شخص کی وراثت کا سوال درپیش تھا، وہ حنفی فرقہ سے تعلق رکھتا تھا اس لئے دعوےٰ کیا گیا کہ اس امر کا فیصلہ حنفی فقہ کے مطابق کیا جائے، جس کی رو سے مفقود الخبر شخص کی موت کا قیاس ۹۰ سال کی عمر کو پہنچنے سے پہلے نہیں کیا جا سکتا۔ عدالت نے یہ دلیل قبول نہ کی اور قرار دیا کہ تصفیہ طلب معاملہ وراثت سے زیادہ شہادت سے متعلق ہے، جس کے بارے میں ایکٹ شہادت مجریہ سال ۱۸۷۲ء کی رُو سے اسلامی قانون ناقابلِ نفاذ ہو چکا ہے۔ اور ایکٹ مذکور کی دفعہ ۱۰۸ کے

مطابق جس شخص کے لاحقین کو سات سال تک اُس کے زندہ ہونے کی خبر نہ ملے، اُسے قانون کے نزدیک مُردہ تصور کیا جاتا ہے۔

(ضمناً یہ سوال غور طلب ہے کہ آیا حنفی فقہ کا یہ مسئلہ اس وقت قابلِ ترمیم نہیں ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جائے گا۔ کہ اس قانونی قیاس کا اوسط متوقع انسانی عمر اور ذرائع آمد و رفت سے گہرا تعلق ہے۔ اب ان دونوں امور میں موجودہ حالات اُس زمانے سے بہت مختلف ہیں، جب کہ یہ قاعدہ وضع کیا گیا تھا)

مسجد شہید گنج کے مشہور مقدمہ میں جسٹس دین محمد کا اختلافی فیصلہ اسلامی قانون کے دائرہ عمل کو وسیع کرنے کی ایک اور ناکام کوشش تھی۔ مختصراً اس مقدمہ کے واقعات یہ تھے کہ لاہور شہر کے چند مسلمان باشندوں نے دعویٰ کیا کہ انہیں اُس عمارت میں نماز ادا کرنے کا قانونی حق حاصل ہے جو مسجد شہید گنج کے نام سے موسوم تھی۔ مسلّمہ طور پر یہ عمارت شروع میں بطور مسجد وقف کی گئی تھی۔ اور ایک خاصے عرصہ تک اس حیثیت سے استعمال بھی ہوتی رہی تھی۔ لیکن اُس کے بعد ایک صدی سے زائد عرصہ تک یہ جگہ ایک غیر مسلم فرقہ کے مخالفانہ قبضہ میں رہی تھی، جس نے اس کو بطور مسجد استعمال نہ ہونے دیا تھا۔ جیسا کہ معلوم ہے مسلمانوں کا یہ دعویٰ خارج ہوگیا۔ ہائی کورٹ میں اس فیصلہ کے خلاف اپیل عدالت کے ایک فُل بنچ نے سُنی، جو چیف جسٹس ینگ۔ جسٹس بھڈے اور جسٹس دین محمد پر مشتمل تھا۔ اکثریت کی رائے کے مطابق اپیل خارج ہوگئی اور عدالت ماتحت کا فیصلہ بحال رکھا گیا۔ جسٹس دین محمد نے ایک مدلل اختلافی فیصلہ کی رُو سے قرار دیا کہ مقدمہ کا فیصلہ اسلامی قانون کے مطابق ہونا ہے اور اسلامی فقہ کے نزدیک مسجد اپنی عمارت سے علیحدہ ایک قانونی شخصیت (JURISTIC PERSONALITY) کی مالک ہے، جو قائم و دائم رہتی ہے۔ خواہ عمارت گر جائے یا کسی کے مخالفانہ تصرف میں چلی جائے۔ اس لئے مخالفانہ قبضہ کی وجہ سے مسجد کی حیثیت بطور عبادت گاہ زائل اور ختم نہیں ہوتی۔

ہائی کورٹ کے فیصلہ کے خلاف مقدمہ کی آخری اپیل پریوی کونسل میں سماعت ہوئی، جس نے قرار دیا کہ مسجد ایک مذہبی ادارہ ہے۔ اس لئے اس کے متعلق تنازعات اُن امور میں شامل ہیں جن کا تصفیہ پنجاب لاز ایکٹ کی رو سے اسلامی قانون کے مطابق ہونا چاہیئے لیکن ایکٹ میعاد کے قواعد بہر حال مسجد پر بھی ویسے ہی حاوی ہیں جیسا کہ کسی دیگر جائداد پر۔ اور یہ کہ اس بنا پر موجودہ واقعات میں مسلمانوں کا حقِ عبادت فریقِ ثانی کے قبضہ مخالفانہ کی وجہ سے زائل ہو چکا ہے۔

اس ضمن میں یہ ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی فقہ میں ایک جائز قانونی حق کے نفاذ کے لئے

کوئی عرصہ بطور میعاد دعوے مقرر نہیں ہے۔

ایک اہم اور پیچیدہ معاملہ جو عدالتوں کو شروع میں ہی پیش آیا وہ اسلامی قانون کی تعبیر کا مسئلہ تھا۔ اُس وقت اعلیٰ عدالتوں کے بیشتر جج غیر مسلم انگریز تھے۔ اس لئے اُن کے لئے یہ سوال اور بھی مشکل اور نازک نوعیت کا تھا۔

اصولی طور پر اسلامی قانون کے دو بنیادی مآخذ قرآن اور حدیث ہیں۔ ان میں سے اوّل الذکر چونکہ وحیٔ ملفوظ کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس کی صحت میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اس کے احکام تمام مسلمانوں کے لئے قابلِ پابندی ہیں۔ دوسرے ماخذ یعنی حدیث کے متعلق بھی مسلمانوں کی ایک بھاری اکثریت کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ بھی وحی کی ہی ایک قسم ہے۔ اس لئے اگر کسی حدیث کا صحیح ہونا ثابت ہو جائے تو اُس کی پیروی کرنا ایسا ہی واجب ہے جیسا کہ احکام قرآن کا۔

اب عدالتوں کے ذمہ یہ کام ہوا کہ مسلمانوں کے ان مذہبی عقائد کو ملحوظ رکھتے ہوئے قرآن کی آیات اور حدیث کے اُن حصوں کی قانونی تعبیر کریں جن کا تعلق کسی زیرِ تجویز مقدمہ کے واقعات سے ہو۔

اصولی طور پر تو یہ کام عدالتوں کے لئے نیا اور مشکل نہ ہونا چاہیئے۔ اسلامی قانون کے مآخذ کی تعبیر کا کام بنیادی طور کسی اور ایکٹ یا دستاویز کی تعبیر سے مختلف نہیں ہے۔ قانونی اصول کے مطابق تعبیر سے مراد کلام کا وہ مفہوم معلوم کرنا ہے جو مقنن یا مصنف کے ذہن میں تھا۔ اور اس غرض کے لئے ایسے اصولی قواعد مقرر ہیں جن کی حیثیت قریباً مسلمہ ہے۔ اور متعلقہ قانونی متن کی تعبیر میں عدالتیں ان قواعد سے استفادہ کرتی ہیں۔ لیکن موجودہ صورت میں دِقت کا باعث یہ امر تھا کہ قرآن اور حدیث کے بیشتر حصوں کی تفسیر اور تعبیر آئمہ نے زمانۂ سلف میں کر دی ہے۔ اور موجودہ زمانے کے مسلمانوں کے تمام فرقے اپنے اپنے امام کی رائے کو مطلق طور پر قابلِ پابندی سمجھتے ہیں۔ اور اس رائے سے انحراف اُن کے لئے جائز نہیں سمجھا جاتا۔ ان حالات میں عدالتوں کے سامنے معین مسئلہ یہ تھا کہ آیا انہیں اس بات کا اختیار حاصل ہے کہ اپنی آزادانہ رائے کے ساتھ اسلامی قانون کے بنیادی مآخذ کی تعبیر کریں۔ خواہ یہ تعبیر آئمہ کی رائے سے مختلف ہی ہو۔

شروع میں اسلامی قانون کے نفاذ کے بارے میں عدالتیں مولویوں سے امداد حاصل کرتی تھیں۔ (اسی طرح ہندوؤں کے شخصی قانون کے متعلق پنڈتوں سے مشورہ کیا جاتا تھا) لیکن جلد ہی ان ماہرین کی خدمات سے استفادہ کرنے کا طریق ختم کر دیا گیا۔ تاہم زیرِ بحث مسئلے پر اس تبدیلی کا کوئی اثر نہ پڑا

سکتا تھا۔ اسلامی قانون کے ان ماہرین کا خود یہ دعویٰ نہ تھا کہ وہ الہامی کتب کی آزادانہ تفسیر کرنے کے اہل ہیں۔ یا کسی ایسے مسئلہ کے متعلق رائے دے سکتے ہیں، جو فقہ کی کتب میں بالوضاحت مذکور نہیں ہے۔ اور اب چونکہ فقہ کی اکثر مستند کتب کا انگریزی میں ترجمہ ہو چکا تھا، اس لئے عدالتوں کے لئے اس میں کوئی دقت نہ تھی کہ ماہرینِ فن کی امداد کے بغیر ہی ان کتب سے رجوع کرلیں۔

یہ حالات تھے جن کے تحت اعلیٰ عدالتوں نے بطور ایک مستقل پالیسی کے ایک اصولی فیصلہ کرلیا کہ وہ قرآن اور حدیث کے متن کی کوئی نئی تعبیر نہیں کریں گے، خواہ اس کے حق میں کتنے ہی وزنی دلائل موجود ہوں۔

آغا محمد جعفر بنام کلثوم بی بی کے مشہور مقدمہ میں واقعات یہ تھے کہ ایک بیوہ نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ اپنے متوفی خاوند کی متروکہ جائداد سے ایک سال کے عرصہ تک اپنے گذارہ کے لئے خرچہ حاصل کرنے کی حق دار ہے۔ اس حق کے لئے بیوہ کی طرف سے قرآن کریم کی سورہ النساء سے ایک حکم پر انحصار کیا گیا۔ اس کے برعکس سُنّی اور شیعہ دونوں کی مستند کتبِ فقہ کی رو سے بیوہ کو خرچہ وصول کرنے کا قانونی حق حاصل نہ تھا۔ چنانچہ ھدایہ میں درج ہے کہ "بیوہ کو خرچہ کا حق حاصل نہیں ہے خواہ وہ حاملہ ہی ہو"۔ اسی طرح امامیہ کے مطابق "بیوہ خاوند کی جائداد سے خرچہ لینے کی حق دار نہیں ہے"۔ اپیل میں یہ تنازعہ پریوی کونسل کے سامنے پیش ہوا۔ اس اعلیٰ عدالت نے اس بارے میں قرآنی حکم کے مقابلہ میں فقہ کے فتویٰ کی پیروی کرنے کو ترجیح دی۔ معاملہ کے اصولی پہلو پر بحث کرتے ہوئے عدالت نے حسب ذیل رائے کا اظہار کیا:۔

"ان مستند کتب (ھدایہ اور امامیہ) کی پیروی کرتے ہوئے اس عدالت کے لئے لازم ہے کہ یہ قرار دے کہ بیوہ اپنے خاوند کی متروکہ جائداد میں سے صرف شرعی حصہ وراثت کی حق دار ہے یا وہ حصہ لے سکتی ہے جو بروئے وصیت اُسے دیا گیا ہو۔ اس سے زائد اُسے کوئی حق جائداد سے خرچہ وصول کرنے کا نہیں ہے۔ یہ فیصلہ کرنا ہمارا فرض نہیں ہے کہ قرآن کی دوسری[ا] سورت کی آیات نمبر ۲۴۱ و ۲۴۲

[ا] "والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجاً وصیة لازواجھم متاعاً الی الحولِ غیر اخراج فان خرجن فلا جناح علیکم فی ما فعلن فی انفسھن من معروف واللہ عزیز حکیم۔ و للمطلقٰت متٰعٌ بالمعروف حقاً علی المتقین"۔ (مدیر)

کے متن کی ھدایہ اور امامیہ میں مندرجہ فتاویٰ کے ساتھ کیوں کر مطابقت پیدا کی جاسکتی ہے۔ لیکن (اصولی طور پر) عدالت کے لئے یہ جائز نہیں ہوگا کہ اس نوع کے معاملات میں قرآن کی آیات کی کوئی جدید تعبیر کی جائے جو قدیم اور عالی مرتبت مفسرین کی رائے کے خلاف ہو۔"

ضمناً یہاں پر پریوی کونسل کے اس فیصلہ کے متعلق جسٹس عبدالرحیم کی رائے کا ذکر کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ فاضل جج نے اپنی کتاب "اسلامی اصولِ فقہ" (MOHAMMADAN JURISPRUDENCE) میں اس فیصلہ پر تنقید کرتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ غالباً پریوی کونسل کے نوٹس میں یہ بات نہیں لائی گئی تھی کہ خرچہ کے حق کی تائید میں قرآن کی جس آیت پر انحصار کیا جا رہا تھا، وہ فی الواقع ایک دوسری آیت کی رد سے منسوخ ہو چکی تھی۔ ظاہر ہے کہ فاضل مصنف کا اشارہ ان آیات کی طرف ہے جن میں ورثہ کے قواعد بیان کئے گئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ راسخ العقیدہ علماء کا مذہب یہ ہے کہ چونکہ بیوہ کو خاوند کی وراثت میں ایک معین حصہ دے دیا گیا ہے' اس لئے اس کے نتیجہ میں قرآنِ کریم کی اُس آیت کو منسوخ سمجھنا چاہیئے جس میں بیوہ کا حق نان ونفقہ و رہائش مذکور ہے۔ کیونکہ مؤخر الذکر آیت اپنے نزول کے اعتبار سے وراثت والی آیات سے پہلے کی ہے۔

لیکن ہماری رائے میں درست پوزیشن یہ ہے کہ وراثت اور خرچہ کے احکام دونوں بیک وقت نافذ کئے جاسکتے ہیں۔ اور کسی آیت کا منسوخ ہونا لازم نہیں آتا۔ بیوہ کے لئے ایک سال بھر کے محدود عرصہ کے لئے خرچہ مہیا کرنے کا ایک خاص مقصد ہے جو اُس کے حقِ وراثت سے قطعاً جُدا ہے۔ ترکہ میں بیوہ کا حصۂ وراثت بعض صورتوں میں اتنی قلیل مالیت کا ہو سکتا ہے کہ اس حصہ کو ایک عمومی اصول کے طور پر خرچہ کے حق کا بدل قرار دینا ایک غلطی ہوگا۔ قرآن کی مستند تفاسیر میں متعلقہ آیت کی تنسیخ کی تائید میں کچھ روایات کا ذکر ضرور آیا ہے لیکن جہاں تک ہمیں علم ہے' ان روایات میں سے کسی کا سلسلہ خود نبی کریمؐ تک نہیں پہنچتا۔ اور ساتھ ہی انہی کتب میں ایسی روایات بھی موجود ہیں، جن سے نظریۂ تنسیخ کی نفی ہوتی ہے۔ سید امیر علی نے اپنی مشہور کتاب "محمڈن لاء" میں لکھا ہے: "کئی فقہاء نے یہ تسلیم کیا ہے کہ بیوہ کو ایک سال تک اپنے متوفی خاوند کی جائداد سے خرچہ حاصل کرنے کا حق حاصل ہے۔ اور یہ حق اُس حصہ سے علاوہ ہے، جس کی وہ بطور وارثہ حقدار ہے۔" زمانۂ حال میں جو رائے زیادہ مقبول ہے' وہ یہ ہے کہ خود

عقیدۂ تنسیخ ہی غلط اور بے بنیاد ہے۔

قرآن مجید کی تفسیر کے متعلق عدالتوں کے عدم اختیار کے بارے میں جو نظیر پریوی کونسل کے مذکورہ بالا فیصلہ نے قائم کی اُس پر عدالتیں نہایت سختی سے عمل پیرا رہی ہیں۔ کم از کم آزادئ ملک تک یہی صورت تھی ــــــ صحیح احادیث میں مشمولہ قانونی احکام کی تعبیر کے بارے میں بھی پریوی کونسل نے اپنے آپ کو اسی غیر لچک دار اصول پر قائم رکھا۔ اگر کسی حدیث کے الفاظ مسلّمہ کتب فقہ کے احکام کے خلاف جاتے ہوں تو عدالت کے لئے وہ حدیث اسلامی قانون کے نفاذ کے معاملہ میں قابلِ پابندی نہ ہوگی۔

اس سلسلہ میں اہم ترین قانونی نظیر فتح محمّد کا مقدمہ ہے جو پریوی کونسل سے ۱۸۹۴ء میں فیصلہ ہُوا۔ اس میں عدالت کے سامنے فیصلہ طلب سوال ایک وقف کے قانونی جواز کا تھا۔ متنازعہ وقف ایک ایسی دستاویز کے ذریعہ قائم کیا گیا تھا، جس میں جائداد کو بظاہر تو وقف قرار دیا گیا تھا لیکن عملاً ایسا انتظام کیا گیا تھا کہ جائداد وقف کنندگان کے خاندان کے تصرّف میں ہی رہے۔ وقف نامہ میں مساکین کے حق میں ہبہ کی گنجائش ضرور رکھی گئی تھی۔ لیکن اس پر عمل صرف اُس صورت میں ہونا تھا جب کہ وقف کنندگان کی اولاد میں سے کوئی فرد بھی باقی نہ رہے۔

ان واقعات کو ملحوظ رکھتے ہوئے پریوی کونسل نے فیصلہ کیا کہ اسلامی قانون کے مطابق اس نوعیت کی دستاویز کو ایک مؤثر اور جائز وقف نامہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ عدالت کی رائے میں ایک مبیّنہ وقف میں مساکین کے حق میں ہبہ کئی وجوہ کی بناء پر غیر حقیقی تصوّر کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً یہ کہ ہبہ والا جزو کُل جائداد کا ایک بہت ہی قلیل یا ناقابلِ لحاظ حصہ ہے۔ یا ہبہ پر عمل کرنے کی صورت ایک طویل زمانہ کے گذرنے پر پیدا ہوتی ہے یا یہ غیر یقینی شرائط کے تابع ہے۔ عدالت کے خیال میں موجودہ وقف نامہ میں جائداد کا خیراتی مقاصد کے لئے استعمال ہونے کا امکان نہایت غیر یقینی اور بعید تھا۔ اس لئے قرار دیا گیا کہ ایسے موہوم مقصد کو ایک جائز وقف کی اساس نہیں بنایا جا سکتا۔

اپنے فیصلہ کے دَوران عدالت نے اس سوال پر چند عمومی خیالات کا اظہار کیا کہ ہندوستان میں انگریزی حکومت کی مقرر کردہ عدالتوں کے لئے اسلامی قانون کے نفاذ کے سلسلہ میں نبی کریمؐ کے وہ اقوال و اعمال کہاں تک قابلِ پابندی ہیں، جو مستند کتب حدیث میں درج ہیں۔

مقدمہ زیرِ بحث میں یہ سوال پیدا اس وجہ سے ہُوا کہ متنازعہ وقف نامہ کے جواز کی تائید میں ایک

فریق نے اس حدیث پر انحصار کیا تھا جس میں نبی کریمؐ سے یہ قول روایت کیا گیا ہے کہ "اپنے خاندان کے افراد کو حاجت مندی سے بچانے کے لئے اُن کے حق میں صدقہ کرنا اُس صدقہ سے بہتر ہے جو گداگروں کو دیا جائے" اور یہ کہ "بہترین صدقہ وہ ہے جو اپنے خاندان کے حق میں کیا جائے"

اس بارے میں عدالت کے سامنے کلکتہ ہائی کورٹ کے ایک فل بنچ کا فیصلہ بھی پیش کیا گیا تھا، جس میں جسٹس امیر علی نے اپنی اختلافی رائے کی تائید میں محولہ بالا حدیث پر انحصار کیا تھا۔ جسٹس امیر علی کے فیصلہ اور زیر بحث مسئلہ کے اصولی پہلو پر تنقید کرتے ہوئے پریوی کونسل نے حسب ذیل رائے ظاہر کی:—

"جہاں تک ہم سمجھ سکے ہیں، اس مسلمان فاضل جج (جسٹس امیر علی) کی رائے کی بنیاد حدیث کا ایک ایسا متن ہے جو کسی معین واقعہ سے متعلق نہیں ہے۔ یا پھر ایسے نظائر ہیں جو بہت نامکمل صورت میں بیان ہوئے ہیں ...... احادیث اسلامی قانون کے ایک بنیادی ماخذ کا درجہ رکھتی ہیں اور عدالت اس امر کو نظر انداز نہیں کر رہی کہ مسلمانوں کے ہاں کہاں تک مذہب اور قانون باہم مخلوط ہیں۔ لیکن اس اپیل کی بحث کے دوران عدالت نے متعلقہ فریق سے یہ سوال کیا کہ جب کہ اسلامی قانون بطور ایک عمومی اُصول کے معمولی ہبہ کے عمل کے ذریعہ اس امر کی اجازت نہیں دیتا کہ جائداد مستقبل بعید میں وجود میں آنے والی اولاد کے حق میں منتقل ہو سکے۔ یعنی اسلامی قانون اس کے خلاف ہے کہ کسی جائداد کی ملکیت کے متعلق ایسے حین حیاتی حقوق قائم کئے جائیں جو یکے بعد دیگرے عمل میں آئیں اور جن میں مالک کو جائداد کے منتقل کرنے کا اختیار حاصل نہ ہو۔ (کم از کم ہندوستان میں رائج اسلامی قانون کی یہی صورت ہے) تو اس کی کیا وجہ ہے کہ وہی عمل ایک برائے نام وقف کی صورت میں جائز قرار دے دیا جائے۔ کیا اس سے یہ سمجھا جائے کہ جائداد کے منتقل کرنے کی جو صورت عام ہبہ کے الفاظ کے ذریعہ عمل میں لانا ناجائز ہے، محض اس لئے جائز ہو جاتی ہے کہ انتقال کنندہ یہ ظاہری الفاظ استعمال کرتا ہے کہ جائداد خدا کے نام پر یا مساکین کے فائدہ کے لئے وقف کی جا رہی ہے۔ جب کہ اپنے نتیجہ کے لحاظ سے معاملہ دونوں صورتوں

میں ایک ہی نوعیت کا ہے۔ ان سوالات کا جواب دینے کی کوشش نہیں کی گئی۔ نہ عدالت کی رائے میں کوئی تسلی بخش جواب دیا جا سکتا ہے۔....

........اس عدالت نے اپنی استعداد کے مطابق انتہائی کوشش کی ہے کہ اسلامی قانون کے وہ قواعد دریافت کئے جائیں جو ہندوستان میں رائج اور نافذ العمل ہیں تاکہ فیصلہ اُن قواعد کے مطابق کیا جائے۔ لیکن عدالت کی رائے میں قانون کی یہ صورت لازمی طور پر اُن سب احادیث کے مطابق نہیں ہے جو کہ نبی کریمؐ سے منسوب کی گئی ہیں۔ احادیث اپنی جگہ ایک اعلیٰ مقام رکھتی ہیں بشرطیکہ موقع اور محل کا لحاظ رکھ کر اُن سے رجوع کیا جائے۔ عدالت کو فاضل جج (جسٹس امیر علی) کی اس رائے سے بھی اختلاف نہیں ہے کہ وقف کے قانون کی تشکیل اور تدوین کے عمل میں احادیث کا ایک اہم حصہ ہے۔ لیکن اُس عظیم المرتبت مقنن (محمد رسول اللہؐ) کی شخصیت سے بے انصافی ہو گی اگر ہم یہ قیاس کریں کہ اُنہوں نے ایک ایسے ھبہ کو مستحسن قرار دیا ہے جس کی رو سے واہب فی الواقع کوئی مالی قربانی نہیں کرتا۔ بلکہ جو چیز وہ بظاہر ایک ہاتھ سے دیتا ہے، دوسرے سے واپس لے لیتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں وقف کی یہ کارروائی محض ایک حیلہ ہے اور اصل مقصد خاندانی جائداد کی آمدنی کو محفوظ کرنا اور جائداد کو ترقی دینا ہے۔ ایسی صورت میں اس کارروائی کو ایک جائز وقف قرار دینے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک تو نام نہاد منتظمین جائداد کی آمدنی کے متعلق حساب کتاب دینے کی کارروائی سے بری الذمہ ہو جائیں گے۔ دوسرے یہ جائداد قرض خواہوں کے مطالبات کی زد سے محفوظ رہے گی۔ مختصر یہ کہ واہب اور اُس کے خاندان کو پوری آزادی حاصل ہو جائے گی کہ یہ لوگ جس طرح چاہیں، جائداد سے مستفید ہوں اور خاندان سے باہر کسی شخص یا ادارے کو سوائے کھوکھلے الفاظ کے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔"

عدلیہ کی طرف سے اسلامی قانون کی جدید تعبیر کے بارے میں اس منفی رویے کا نتیجہ یہ ہوا کہ عدالتی نظائر کے ذریعہ اس قانون میں تبدیلی اور ارتقاء کی راہ قریباً مسدود ہو گئی۔ (مسلسل)